

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

## اشارات

بعض سادہ لوح افراد جو اشتراکیت کو غلط فہمی کی بنا پر معاشی عدل کا ایک موثر پروگرام سمجھ بیٹھے ہیں ہم سے بار بار پوچھتے ہیں کہ ہم انسان فوڑ و فلاح کی اس تحریک کی آخر کیوں تائید اور حمایت نہیں کرتے ان سب حضرات کے استفسار کے جواب میں ہم نہایت واضح طور پر یہ بات کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک انسانی فلاح بہبود کا کوئی پروگرام جس کی بنیاد تعلیم ربانی پر نہ ہو، سراسر ضلالت اور گمراہی ہے اور اس سے نہ صرف ہم خود خدا کی پناہ مانگتے ہیں بلکہ پوری انسانیت کو بچانے کے آرزو مند ہیں جو نظر یہ یا طرز عمل انسان کے لیے آخرت میں گھٹانے کا سودا ہے اس کے اپنانے سے اس دنیا میں کبھی فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض سادہ لوح دوزخ کی کلفتوں کو حنیت کی آسائش خیال کرنے لگیں۔

ہم صرف اشتراکیت کے مخالف نہیں بلکہ دنیا کی ہر اس شے، دنیا کے ہر اس تصور اور دنیا کے ہر اس طرز فکر اور عمل کے مخالف ہیں جو اسلام سے متضاد ہو۔ ہم انسانیت کی آخری فلاح اور دنیوی کامرانی کا حامل سرچشمہ اسلام اور صرف اسلام کو سمجھتے ہیں اور اس بات پر یختہ ایمان رکھتے ہیں کہ جو نظام حیات اسلام کی ضد ہے وہ کبھی بھی خیر و برکت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ہر قسم کے خارجی دباؤ اور رائے عام کے بہاؤ کو کبیر نظر انداز کرتے ہوئے ہمیشہ ہر اس قول اور فعل کی مخالفت میں آواز بلند کی جسے ہم نے اسلام کا لقیض سمجھا ہے۔ ہم سے اگر جائز طور پر پوچھا جاسکتا ہے تو صرف یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ ہمارے پاس کسی فلسفہ زندگی یا نظام حیات کو خلاف اسلام کہنے کے کیا دلائل ہیں۔ ہم نے پہلے ہی جب کسی پالیسی یا نظریہ کی مخالفت کی تو دلائل اور مقبولیت کے ساتھ کی اور جذبات کے اندر ہر میکان پیدا کر کے اپنی بات منوانے سے ہمیشہ گریز کیا۔ اور یہی ہمارا طرز عمل

اشتراکیت کے بارے میں ہے ہم اس نظام حیات کے اس وجہ سے حامی اور مؤید نہیں ہو سکتے کہ یہ نظام جس بنیادی تصور پر قائم ہے، جو فلسفہ اخلاق پر پیش کرتا ہے، جس طریق زندگی کو یہ قائم کرنا چاہتا ہے، اور اسے قائم کرنے کے لیے جو طریق کار یہ تجویز کرتا ہے وہ اسلام کے اساسی تصورات اس کے نظام اخلاق، اس کے طریق زندگی اور اس کے طریق اصلاح سے ہر قدم پر متصادم ہے۔ اسی بنا پر ہم اسے کسی قیمت پر قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ ان صفحات میں ہم مختصر طور پر ان بنیادی نکات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جن میں اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

اسلام اور اشتراکیت کے درمیان سب سے پہلا اختلاف عقائد کا اختلاف سے بعض طرح میں افراد عقیدے کے اختلاف کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ مگر یہ کم عقلی ہے۔ عقیدہ وہ بیج ہے جس سے کسی نظام حیات کی کونپلیں پھوٹی ہیں جس نوعیت کا بیج ہوگا اسی نوعیت کا نظام حیات پروان چڑھے گا۔ اس نظام کے فلسفہ زندگی، اس کے نظریہ اخلاق، اس کے تمدن، اس کی معاشرت اور معیشت الغرض اس کے سارے گوشوں میں عقیدے کے اثرات پوری طرح نمایاں ہونگے۔

عقائد میں سب سے پہلی اور بنیادی بات یہ دیکھی جاتی ہے کہ کوئی نظام حیات تخلیق کائنات کی علت کے قرار دیتا ہے کیونکہ اس علت ہی سے کسی نظام کا فراج، اس کے عناصر ترکیبی، اس کے خوب و ناخوب کے پیمانے اور اس کی غایت متعین ہوتی ہے۔

اسلام کے نزدیک اس کائنات کی علت ایک حقیقی و قیوم اور قادر مطلق ذات کا ارادہ ہے۔ وہ انسان کے سامنے یہ دعویٰ پیش کرتا ہے اور اس دعوے کی صداقت پر وہ پوری کائنات کو گواہ بنا رہا ہے کہ قدرت کا یہ وسیع و عریض کارخانہ کسی اندھی بہری قوت کا کھیل نہیں بلکہ ایک حکیم و علیم ذات کی قدرت کا کرشمہ ہے جسے اس نے بڑی حکمت و دانائی کے ساتھ نہایت ارفع و اعلیٰ مقاصد کی خاطر تخلیق کیا ہے اور اب وہی ہر آن اس کی تدبیر و نگرانی کر رہا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید اولین بنیادی عقیدے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعِبَادٍ ۚ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ

أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (الدخان - ۳۸-۳۹)

”اور آسمان وزمین اور جو ان کے درمیان ہے یہ سب کچھ ہم نے کھیل نماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے ہم نے ان کو برقی پیدا کیا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔“

وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَكُمْ لَا مَعْشِقَ لِكُمِهِ وَهُوَ سَوِيحُ الْحِسَابِ ۝ (الرعد - ۴۱)

”اللہ ہی فیصلہ کرتا ہے اور اس کے فیصلہ کو کوئی ٹانے والا نہیں۔ اور وہ بہت جلدی حساب بیٹنے والا ہے ان دونوں آیات سے کائنات کی اُس علت غائی کا صاف پتہ چلتا ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔“

جب یہ بات طے ہو گئی کہ اس کائنات کا کوئی خالق و مالک اور مگر ان ہے اور اس نے اسے ایک خاص حکمت و مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے تو اس سے یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی ہے کہ انسان جو اس کائنات میں خالق کی تخلیق کا شاہکار ہے اسے اس دنیا میں ارتعاش کی خاطر بنایا ہے اور پھر خدا کے حضور میں اپنی کارکردگی کا حساب پیش کرنا ہے۔ وہ عناصر اربعہ کا کھیل نہیں۔ وہ مادی قوتوں کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا بھی نہیں بلکہ وہ ایک نیا طرح مہنتی ہے جسے خدا کی طرف سے عائد کردہ فرائض کو سرانجام دینا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَنۡتُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَقُوْرُ الَّذِي خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طَبَقًا ۗ مَا تَرٰى فِيۡ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ۗ ط فَاَرۡجِعِ الْبَصَرَ هَلۡ تَرٰى مِنۡ فُطُوْرٍ ۗ (الملك - ۲-۳)

”وہ جس نے موت اور زندگی بنائی تاکہ اس بات کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔ اور وہ زبردست اور غصہ ور ہے جس نے سات آسمان تہ بہ تہ بنائے۔ کیا رحمن کی تخلیق میں تم کوئی بے ٹکانہ دیکھتے ہو؟ پھر ملٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟“

فادو مطلق نے موت و حیات کا جو نظام قائم کر رکھا ہے اس کی نوعیت یہ نہیں کہ سطح آب سے ہوا کے معمولی ارتعاش کے ساتھ چند بلبل نمودار ہوتے اور پھر اسی ہوا کے خفیف جھونکے کے ساتھ نسبت و نابود ہو گئے۔

جس خالق نے بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ کائنات کا یہ متوازن اور پوری طرح ہم آہنگ اور رافع نظام تخلیق کیا ہے اسی نے موت و حیات کی بھی تخلیق کی ہے تاکہ وہ یہ دیکھے کہ انسان اپنی زندگی کے اُس دائرے میں جس میں اسے عمل کی آزادی دی گئی ہے کہاں تک احکامِ الہی کی پیروی کر کے اپنے آپ کو مالک کا فرما بنو اور بندہ ثابت کرتا ہے۔ بالغ نظر مفسرین نے موت و حیات کے درمیان حروفِ عطف کے استعمال سے یہ استدلال کیا ہے کہ موت و حیات ایک دوسرے کے طبعی نتائج نہیں بلکہ دونوں الگ الگ نظام ہیں جنہیں قادرِ مطلق اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت چلا رہا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ انسان کا وجود عناصر میں ظہور ترکیب کا فطری نتیجہ اور اس کی موت ان عناصر کا ناگزیر بگاڑ ہے، بالکل غلط ہے۔

قرآن مجید انسان کو اس دنیا میں خدا کا نائب اور خلیفہ سمجھتا ہے اور اُس سے اس بات کی توقع رکھتا ہے کہ وہ جس بلند و بالا ذات کا خلیفہ ہے اس کے منشا کو اس دنیا میں پورا کرے۔ چنانچہ اس نے انسان کی خلقت کے ساتھ اس امر کا بھی اعلان کیا ہے کہ جو کچھ اس زمین میں موجود ہے وہ اسی کے لیے پیدا کیا گیا ہے بلکہ اس کے لیے مسخر کر کے (مَسْحُورٌ لَّكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ)، اس سے استفادہ آسان بنا دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیات اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہیں کہ یہ زمین اور اس کے مادی وسائل انسان کے تابع ہیں اور انسان ان کے تابع نہیں۔ لہذا وہ سارے نظریات جن میں انسان کے بارے میں یہ مفروضے قائم کیے گئے ہیں کہ فرد اور معاشرہ کے افکار و اعمال کی صورت گری بر دور کے مادی اور معاشی حالات کرتے ہیں قرآن مجید کی رُوس سے غلط ہیں بلکہ برعکس قرآن حکیم ہمیں اس حقیقت سے آشنا کرتا ہے کہ انسان اس دنیا میں مادی ماحول کا غلام بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ اس کا حاکم بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ وہ خداوند تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس میں تصرف کر کے ان اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کرے جو خالق کائنات نے اس کے لیے مقرر کر رکھے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک نہیں بلکہ بیسیوں مقامات پر اس حقیقت کی وضاحت ملتی ہے کہ یہ دنیا اگرچہ انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے مگر انسان خود خدا اور آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہی انسانیت کا مرجع و منہا ہے۔ وَالْإِلٰهِي رَبِّكَ الرَّحْمٰنُ - وَالْإِلٰهِي رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی - وَالْإِلٰهِي تَوْحِيدٌ - وَالْإِلٰهِي الْمَصْبُورُ وَالْإِلٰهِي مَابِ كَالْفَاعِلِ قرآن مجید میں بار بار آتے ہیں جو انسانی زندگی کے

حقیقی مقصد کی صاف الفاظ میں نشاندہی کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خصلت کو ایک تمثیل سے اس طرح واضح فرمایا ہے: **الدُّنْيَا مَرَرَةٌ كَالْأَخِيَّةِ**۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یعنی اس میں انسان کی محنت و مشقت اور اوزار و آلات سے استفادے کی غرض بجز اس کے اور کوئی نہ ہونی چاہیے کہ اس سے آخرت میں علاج و کامرانی کی فصل کاٹی جاسکے۔

قرآن مجید کے اس تصور سے انسان کے بارے میں چند اور حقائق بھی سامنے آتے ہیں:

۱۔ انسانی فکر و عمل کا محرک مادی نہیں بلکہ سراسر روحانی اور اخلاقی ہے۔ کیونکہ اگر یہ محرک مادی ہو تو پھر انسان کے لیے فطری طور پر یہ ناممکن ہے کہ وہ اس کی بنا پر کسی دوسرے غیر مادی مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر سکے۔

۲۔ دوسرے جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان اس کائنات میں خالق کے غشا کو پورا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور وہ اخلاقی و روحانی مقاصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنے پر مامور ہے تو پھر اس سے یہ بات خود بخود طے ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے فکر و عمل میں کسی حد تک آزاد ہے۔ کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان مادی قوتوں کے دباؤ کی وجہ سے ایک مخصوص طرز فکر اور طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور ہے تو پھر اس کے افکار و اعمال کی روحانی اور اخلاقی قدر و قیمت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ اگر انسان نیکی اور بدی اختیار کرنے کے لیے آزاد اور خود مختار نہ ہو تو اس کی ذات اخلاقی صفت کے تئیں عنصر سے محروم ہو جاتی ہے۔

اس تصور سے پھر یہ بات بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ انسانی فکر و عمل میں آزادی بنے ہی حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کیا ہے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ دنیا میں کوئی فرد یا معاشرہ جو کچھ کر رہا ہے وہ خارجی حالات کا ناگزیر نتیجہ ہے تو اس میں کئی طرز عمل پر نیک و بد یا محمود و مذموم کا اطلاق کس طرح ہو سکتا ہے؟ پھر بات یہاں تک ہی محدود نہیں رہتی، بلکہ خیر و شر کے درمیان ساری تفریق ختم ہو جاتی ہے جب یہ فرض کر لیا جائے کہ سارے انسانی افکار و اعمال مادی ماحول کا عکس ہیں تو اس اعتبار سے کسی نظر یہ یا عمل کا مؤثر وجود ہی اس کے صحیح اور برحق ہونے کی سب سے قوی دلیل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز غالب ہے وہی برحق ہے اور جو چیز

منگوب ہے وہ باطل ہے۔ اس نظریہ کے مطابق دنیا میں کسی طرز فکر یا طرز عمل کی بنیاد اس کا اخلاقی اور روحانی پہلو نہیں بلکہ عالم واقعات میں اس کی قوت اور طاقت کا مظاہرہ ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے حاملین نے اپنی بات کو برحق منوانے کے لیے ہمیشہ اندھی بہری قوت سے کام لیا ہے اور اس امر کی کوشش کی کہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے ان کے دلپسند افکار و نظریات کو دنیا میں باجبر مسلط کیا جاسکے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کسی تصور یا عمل کی غالب حیثیت ہی اس کی صحت کی سب سے بڑی شہادت فراہم کرتی ہے۔ اس بنا پر ان لوگوں نے ذرائع کے صحیح اور غلط ہونے کو ہمیشہ نظر انداز کر کے اس امر کی کوشش کی کہ جس ذریعہ سے بھی ممکن ہو ان کی بات غالب ہو جائے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے ہر قسم کے جھوٹ، مکر و فریب اور تشدد سے کھنے بندوں کام لیا گیا اور اس معاملے میں کسی قسم کی کوئی معمولی غلطی بھی محسوس نہ کی گئی۔ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ مقاصد ہی ذرائع اور وسائل کا جواز پیدا کرتے ہیں (ENDS JUSTIFY THE MEANS)۔ اگر مقاصد جھوٹ اور فریب سے حاصل ہوتے ہوں تو پھر عیاری ہی پسندیدہ اور قابل تعریف طرز عمل ہے۔ اور اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے جبر و زور تھپا ثابت ہوتا ہو تو پھر تشدد کا بے دریغ استعمال ہی صحیح اور انساب ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس طرز فکر کے علمبردار ہیں ان کے ہاں مقاصد کو ہمیشہ سازشوں، جھوٹوں، اور تشدد کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہے اور کبھی اپنے مقصد کے حصول کے لیے اخلاقی ضابطوں کی پابندی نہیں کی گئی

اس فلسفہ حیات کا ایک اور المناک پہلو یہ ہے کہ خارجی ماحول کو غیر معمولی اہمیت دینے کی وجہ سے یہ غلط خیال ذہن میں بٹھا دیا گیا ہے کہ کسی صحت مند تبدیلی کے جذبات انسان کے اندر سے پیدا نہیں کیے جاسکتے انسان خارجی قوتوں کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی ہے، اس لیے اس کی زندگی میں اگر کوئی انقلاب آسکتا ہے تو اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے خارجی حالات کو بدل دیا جائے۔ چنانچہ دورِ جدید میں اصلاح حال کے سارے پروگراموں میں پورا زور خارجی حالات کے بدلنے پر صرف کیا جاتا ہے اور اندر کے انسان پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی قرآن مجید اس خیال کو باطل قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسانی معاشرت ہمیشہ سیاست اور اخلاق کا کوئی نظام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اندر کے انسان کی اصلاح

نہ کی جاتے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ  
کامیاب ہو گیا وہ جس نے نفس کو سنوارا اور نامراد

ہوا جس نے اسے دبا دیا۔

رائشس: ۹-۱۰

دشہاہ

یعنی جس نے نفس انسانی کو غلط رجحانات اور میلانات سے پاک صاف کر کے نیکی اور خدا پرستی کے جذبہ سے معمور کیا وہ فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہوا، اور جس نے نفس کے اندر بھلائی کو نشوونما دینے کے بجائے اٹا اسے دبا دیا وہ فلاح سے محروم ہو گیا۔ کلام الہی میں تزکیہ نفس کو انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے اولین مقصد میں شمار کیا گیا ہے۔

جس طرح ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول

کَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو

بیجا، جو تمہیں چاری آیات منات ہے، تمہارا تزکیہ کرتا ہے

عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ

تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ کچھ

وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ

سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے

البقرہ-۱۵۱

- اصلاح نفس انبیاء علیہم السلام کے فرائض میں داخل ہے اور ان پر اس بات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے

کہ وہ انسان کے خارجی حالات میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے سے پہلے انسانی نفوس کو اندر کی آلائشوں سے پاک کریں، انہیں غلط رجحانات سے ہٹا کر نیکی اور خدا ترسی کی راہ پر ڈالیں اور انسان کے انفرادی اور اجتماعی اخلاق و کردار کو خدا پرستی کی بنیاد پر استوار کریں، کیونکہ جب تک دل کی دنیا میں کوئی خوشگوار انقلاب نہیں آتا اس وقت تک خارجی ماحول میں کوئی صحت مند تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ خارج کی تبدیلی کے لیے کوئی اسکیم چاہے کتنی ہی شاندار بنالی جاسے، اگر اندر کا انسان بگڑنا ہوا ہو تو وہ بہتر سے بہتر اسکیم کو بھی غارت کر کے رکھ دیتا ہے۔

نقطہ نظر کے اس اختلاف کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے طریق انقلاب اور مادہ پرستیوں کی

انقلابی سرگرمیوں کے درمیان نہایت واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ خدا کے رسول اور ان کے تابعین کی پہلی

توجہ اصلاحِ باطن کی طرف مبذول ہوتی ہے اور وہ متعین اور ترغیب کے ذریعے اور خود اپنی پاکیزہ زندگی کا عملی نمونہ پیش کر کے انسانوں کے قلب و دماغ میں نیکی اور پرہیزگاری، خدا خوفی اور شرافت کے نیک احساسات و جذبات پیدا کرتے ہیں اور پھر ان جذبات کی بنیاد پر خارجی ماحول کو پاکیزہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طریق انقلاب کے علمبرداروں کی زیادہ تر کوشش تعلیم و تبلیغ اور اصلاحِ نفوس پر صرف ہوتی ہے اور اس امر کا پوری طرح اہتمام کیا جاتا ہے کہ جس پاکیزگی اور خدا ترسی کو انسان نے داخلی طور پر قبول کیا ہے اسے خارجی زندگی میں تسلیم کر لیا جائے تاکہ انسان کی داخلی اور خارجی زندگی دونوں اطاعتِ خداوندی کا نمونہ پیش کریں اور اس بنا پر ان دونوں کے درمیان مکمل مطابقت اور ہم آہنگی پیدا ہو۔

ان گذارشات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انبیاءِ علیہم السلام کے طریق انقلاب میں قوت کے استعمال کی کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ کے رسولوں نے ضرورت کی حد تک اور احوال کے تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے قوت سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ قوت وہ آخری ہتھیار ہے جس سے ان حضرات نے اُس حالت میں کام لیا ہے جبکہ اصلاحِ نفوس کی کوششوں کے باوجود عملاً اصلاح میں کوئی کسر رہ گئی ہے۔ انہوں نے اپنی بیشتر قوتیں اور صلاحیتیں لوگوں کے قلب و دماغ میں خداوند تعالیٰ کی عظمت کا نقش بٹانے اور ان کے اندر احساسِ جو ابد ہی پیدا کرنے میں صرف کیں۔ حق کو واضح کرنے، اسے ذہن نشین کرانے اور حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کرنے اور پھر انسان کو خود اپنی رضا سے حق کی طرف مائل کرنے کے لیے جس قدر بھی کوشش کی جاسکتی تھیں، انہوں نے ان میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اس راہ کے سارے مصائب کو بڑے صبر کے ساتھ برداشت کیا اور ساری نراحتوں اور مخالفتوں کے باوجود اپنے مقدس مشن کو جاری رکھا۔ لیکن جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ظالم اور بدتماش لوگ قوت کے بل بوتے پر انسانی انسان کو خدا کی مستط کرنے پر اور ان کی خواہش اور آرزو کے باوجود وہ انہیں جھوٹے خداؤں کی گرفت سے آزاد نہ ہونے دے رہے ہوں تو اس وقت شیاطین کے چنگل سے ان مظلوموں کو نکلانے کے لیے قوت کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یوں عام حالات میں دینی اور اخلاقی نظامِ قرآنی اور عملی تبلیغ کے ذریعے ہی انسانوں کے اندر نفوذ و برتری



کرنا اور پروان چڑھنا ہے۔

کسی مادی اور اخلاقی نظام میں یہ فرق درحقیقت اُس بنیادی نقطہ نظر کا مظہر ہے جو کوئی نظام انسان اور انسان کے درمیان تعلقات کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔ اسلام پوری نوع بشری کو ایک وسیع برادری سمجھتا ہے کیونکہ سب انسان ایک ہی باپ کی اولاد اور ایک ہی خالق کے عیال ہیں۔ اس بنا پر ان کے درمیان فطری طور پر محبت اور یکجہلیت ہونی چاہیے اور اگر وہ اس کے برعکس نفرت اور حسد کے جذبات پالتے ہیں تو وہ درحقیقت اپنی فطرت سے انحراف کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ہمدردی، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا، ایک دوسرے سے تعاون اور ایک دوسرے کی بے لوث خدمت انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کیونکہ یہ وہ مثبت اور تعمیری صفات ہیں جو انسانوں کے اجتماعی تعلقات کو وجود میں لانے کے لیے انتہائی ضروری ہیں اسی لیے انسان ہمیشہ سے ان صفات کو بہترین انسانی صفات سمجھتا رہا ہے۔ اور قرآن کریم میں بار بار خدا کے بندوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم اس دنیا میں انسانوں بلکہ حیوانوں کے ساتھ بھی بھلائی کا سلوک کرو، ایک دوسرے کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو، آپس میں خیر خواہی کا رویہ اختیار کرو، انسانوں کے درمیان حق و صداقت اور عدل و انصاف کے علمبردار بن کر رہو اور کسی دشمن کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ ظلم اور ناانسانی کرنے لگو۔ دنیا میں جب کبھی بھی دینی اور روحانی نظام قائم ہوتے تو معاشرے میں انسانی ہمدردی اور محبت کے چٹھے اہل پڑے اور ہر انسان نے دوسرے انسان کا دمساز اور رفیق بن کر زندگی بسر کرنے کی کوشش کی۔

اس کے برعکس مادی نظام اجتماعی تعلقات کی نہایت بھیانک توجیہ پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی فطرت کا ہیولی خود غرضی، باہمی عناد اور کشمکش اور دشمنی سے تیار کیا گیا ہے۔ انسان کے وہ اعمال جو بظاہر اس کے جذبہ ایثار اور ہمدردی کی ترجمانی کرتے ہیں ان کی تہ میں بھی صرف خود غرضی ہی کارفرما ہوتی ہے۔ انسان مادی خواہشات اور لذتوں کا غلام ہے اور ان کے حصول کی خاطر ہی وہ سرگرم عمل ہوتا ہے۔ ان مادی تناؤں کے سوا وہ کوئی دوسری تمنائیں نہیں رکھتا اور ان حیوانی مقاصد کی تکمیل کے سوا اس کے سامنے

کوئی دوسرے مقاصد نہیں ہوتے۔ وہ دنیوی فائدوں ہی کے لیے جینا ہے اور انہی کی آرزو میں مرتا ہے۔ اس فلسفہ کی دوسرے انسان اگر حیاتِ اجتماعی کا خواہشمند ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اپنا نئے نوع کے ساتھ مل کر آرام اور سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، یا پاکیزہ اجتماعی زندگی میں روح کا سکون تلاش کرتا ہے، یا اجتماعی ماحول سے اُسے اخلاقی احساسات کو جلا دینے کے مواقع میسر آتے ہیں اور اس طرح اس کا جوہر انسانیت کھرتا ہے بلکہ اس کی وجہ محض جذبہ خود غرضی ہے۔ انسان کی مادی خواہشات کا اصل تقاضا تو یہ ہے کہ دوسرے انسان اس کی حرص کی بھینٹ چڑھیں، لیکن اگر وہ معاشرے میں ایک دوسرے کے ساتھ انصاف یا دیانت یا ہمدردی کرتا بھی ہے تو اس بنا پر کہتا ہے کہ ایسا نہ کرنے سے بالعموم اس کی اپنی اغراض کو نقصان پہنچتا ہے یعنی باغافلہ دیگر جب کسی نقصان کا خطرہ یا اندیشہ نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ آدمی دوسرے کے ساتھ انصاف یا دیانت یا ہمدردی کرے۔

جس نظام میں خود غرضی کو اجتماعی زندگی کی اساس قرار دیا جائے اور جس میں انسان کو یہ باور کرایا جائے کہ حتیٰ خواہشات کے سوا اس کے دل میں کوئی دوسری خواہش موجزن نہیں ہو سکتی، اُس میں انسانوں کے درمیان کشمکش، مزاحمت، عداوت اور نفرت کا پیدا ہو جانا بالکل ناگزیر ہے۔ چنانچہ انسانیت کے اس تاریک تصور کے بدلے اجتماعی زندگی کے متعلق جتنے نظریات نے بھی جنم لیا ہے ان کی رُو سے انسان اور انسان کے درمیان اور انسانوں کے مختلف طبقات یا قوموں کے درمیان عداوت اور دشمنی حیاتِ اجتماعی کے لوازم ہیں۔ بلکہ ان نظریات کی روشنی میں پوری انسانی تاریخ ایک ایسے خوفناک کارزار کا نقشہ پیش کرتی ہے جس میں ہر انسان اور ہر طبقہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے اور نسلِ انسانی کا ہر فرد اور گروہ نہایت گھٹیا مقاصد کی خاطر ایک دوسرے کو مٹانے کے درپے ہے اور اس باہمی آؤدیش اور دشمنی ہی سے نسلِ انسانی ترقی کی راہ پر آگے بڑھ رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان باہمی ایشار اور ہمدردی اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون انسانی خلل و بہبود کی راہ نہیں ہے بلکہ حسد اور رقابت اور ایک دوسرے کے ساتھ سنگ دلائی بڑاؤ اور سر چھوٹل ارتقاء اور ترقی کی راہیں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانوں اور گروہوں کے مابین لڑائی، جھگڑے ہوتے رہے ہیں اور خود غرض افراد نے بعض اوقات کمزور اور بے بس انسانوں کو حرص و آرزو کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ مگر انسانیت کے بارے میں یہ تصور بالکل غلط اور گمراہ کن ہے کہ یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے، کیونکہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب ان صفات کو پسندیدہ انسانی صفات شمار کیا گیا ہو۔ اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ تعاون اور بھدردی کرنے کے بجائے ہمیشہ خود غرضی کا طرز عمل ہی اختیار کیا ہے اور دنیوی مفادات کے لالچ میں انسان ہمیشہ ایک دوسرے کو تباہ و برباد ہی کرتے رہے ہیں۔ باری تعالیٰ نے انسان کو اچھے جذبات اور نیک احساسات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس بنا پر عداوت و نفرت اس کی فطرت کے طبعی خواص نہیں بلکہ ذہنی عوارض ہیں۔ صحیح تعلیم و تربیت سے اور انسانیت کے اچھے نمونے سامنے لانے اور پاکیزہ ماحول کے میسر آنے سے ان عوارض کو دور کیا جاسکتا ہے اور اس طرح انسانی طبیعت کو اس کی فطری نیکی اور شرافت کی طرف لوٹایا جاسکتا ہے۔ بلکہ بارہا چھوٹے یا بڑے پیمانے پر لوٹایا گیا ہے، اور انسانوں نے صدیوں ان لوگوں کو عزت کے ساتھ یاد کیا ہے جنہوں نے نوع انسانی کو بھلائی کی یہ راہ دکھائی ہے۔ مگر انسانیت کے بارے میں مادہ پرستوں کے گمراہ کن تصورات نے ذہنی عوارض اور اخلاقی بیماریوں کو انسان کی اصل فطرت قرار دے دیا اور خدا ترسی اور انسانی محبت کے فطری رجحانات کی یکسر تکذیب کر ڈالی۔ انسان کے ساتھ اس سے بڑی دشمنی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے متعلق یہ رائے قائم کر لی جاسے کہ جنگ و جدال، دشمنی اور منافرت اس کے زندگی کے بنیادی عناصر ہیں اور نیکی اور بھلائی محض اعتباری اور ان ہونی باتیں ہیں۔

انسان کی فطری خود غرضی کے اس نظریہ نے کائنات کے بارے میں انسان کے تعلق کو بھی متاثر کیا ہے۔ آپ کسی موضوع پر اس نظریہ کے حاملین کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو یہی تاثر ملے گا کہ فطرت کوئی ایسی اندھی بہری قوت ہے جو انسان پر تسلط قائم کرنے کے لیے بیتاب رہتی ہے اور اسے نقصان پہنچانے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ اس کے مقابلے میں انسان بھی ہر لمحہ اس بھری ہوئی قوت پر غلبہ پانے

(باقی صلا پر)

## بقیہ اشارات

کے لیے کوشاں رہتا ہے اور ہر آن ایسی تدابیر سوچتا اور ایسے ذرائع اختیار کرتا ہے کہ اسے مغلوب کیا جاسکے۔ انسان فطرت کو اپنا حریت سمجھتا ہے اور فطرت انسان کی سب سے بڑی دشمن و مزاحم طاقت ہے۔ تفسیر کا تاثر کی اصطلاح میں انسان اور فطرت کے درمیان باہمی عداوت کا یہی غلط نظریہ پوری طرح جھلکتا ہے۔

اس تصور کی بنیاد پر جتنے فلسفے بھی گھڑے گئے ہیں وہ فطرت کا نہایت ہی گھناؤنا عکس پیش کرتے ہیں۔ ان سب کی رُوح یہ ہے کہ فطرت حسنِ ازل کی جھلک نہیں، رحیم اور مہربان خالق کا عطیہ نہیں، بلکہ قہر و غضب کی طاقت ہے جو انسانوں کو ہر لمحہ اپنے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنا تی رہتی ہے اور جب تک انسان اپنی قوت کے زور سے اسے زیر نہیں کر لیتا ہے اس وقت تک وہ اس کے شر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی باطل تصور کے تحت ادباء و شعراء نے اس کے اندر خانی کا حسن و جمال دیکھنے کے بجائے اُسے روح فرسا مناظر کا مرقع سمجھا اور اسے ایک پرندے سے تعبیر کیا جس کی چوہچ اور پنچے خون آلود ہوں۔

فطرت کے بارے میں اس تاریک تصور سے ڈارون کے نظریہ ارتقاء اور ماتیس کے نظریہ آبادی نے جنم لیا اور انسان کے دل میں یہ غلط احساس بٹھایا کہ فطرت دنیا کی ہر ذی رُوح شے کی مخالف اور دشمن ہے اور وہ اس سے اپنی دشمنی کا اظہار اس طرح کر رہی ہے کہ اس نے وسائل کو اس کی ضروریات سے ہمیشہ کم اور غیر مناسب رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر آن اور ہر طرف ایک کشمکش برپا ہے اور ہر ذی رُوح اور نوع کا ہر فرد محض بقا کے لیے ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہے اور جو اس کشمکش میں باقی رہ جاتا ہے وہی جینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق حالات کی نامساعدت اور مجبوری سے ارتقاء کا عمل شروع ہوتا ہے اور مسلسل آویزش کے ذریعے بلند تر انواع پیدا کرتا ہے۔

اس طرح آبادی کے معاملے میں بھی یہ تاثر قائم کیا گیا ہے کہ فطرت انسانوں کے ساتھ بڑا شرمناک کھیل کھیل رہی ہے۔ انسانی آبادی میں سرعت کے ساتھ اضافہ کرتی چلی جاتی ہے مگر اس کے مقابلے میں خوراک کی پیداوار

بڑھنے نہیں دیتی اور اس طرح انسان کی تباہی اور بربادی کا سامان کرتی ہے۔ فطرت کے اس ظلم و استبداد سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ انسان کو بالکل منظم کر کے اور اسے بے حس ٹینک اور منجنیق بنا کر فطرت کے خلاف جنگ آنا ہونے پر آمادہ کیا جائے۔ ظاہرات ہے کہ یہ بات اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ انسان کی آزادی سلب کی جائے اور اس کے متعلق یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ اُسے بھی مشین کے بے جان پُرزے بنا کر اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی مفروضے کے تحت اب انسانوں کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے اور نظم اجتماعی اُن سے اُسی بے حس کے ساتھ کام لیا ہے جس بے حس کا مظاہرہ کوئی مشین اپنے پُرزوں کے معاملے میں کرتی ہے۔

منصوبہ بندی کا یہ تصور محض اشتراکی نظام ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر مادی نظام کا فطری خاصہ ہے۔ یہ درحقیقت اس بات کا اعتراف ہے کہ مادی حالات نہ صرف انسانی زندگی کی خارجی ہیئت کو تشکیل دینے میں فیصلہ کن اہمیت رکھتے ہیں بلکہ داخلی کیفیات کو بھی جس سانچے میں چاہتے ہیں ڈھال لیتے ہیں۔ چنانچہ جس دن سے مادیت نے انسانیت کے دل و دماغ پر قبضہ کیا ہے اسی روز سے انسانی زندگی کی جکڑ بندی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ انسانی زندگی کو منظم کرنے کے لیے جب داخلی طور پر کوئی محرک باقی نہ رہے تو اسے کسی نظم کا پابند بنانے اور اس کی صلاحیتوں کو کسی راہ پر لگانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُسے اجتماعی جکڑ بندیوں کے حوالے کر دیا جائے تاکہ اجتماعیت اس کی قوتوں سے پورا فائدہ اٹھاسکے۔ قوم پرستی، نسل پرستی، وطن پرستی اور ریاست اور مملکت پرستی سب مادی تصور کے مختلف شاخسانے ہیں۔ ان میں کیفیت کا کوئی فرق نہیں بلکہ جو کچھ فرق ہے وہ صرف دائرہ کار کا ہے۔

اجتماعیت کے جھوٹے خدا کی پرستش نے انسانی زندگی کی روحانی اور اخلاقی بنیادوں کو جس قدر شدید نقصان پہنچایا ہے اس کے تصور سے انسانی روح کا نپ اٹھتی ہے۔ انسان جب کسی مشین کا بے بس پرزہ ٹھیرا تو پھر معاشرے کو اس کے جذبات و احساسات کا احترام کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس پُرزے کو کسی مقام پر فٹ کرنے کے لیے صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ اسے اس مقام پر رکھ کر ملکی دولت میں کس قدر

اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ روس کے بیگار کیمپ اس اجتماعیت کی نہایت گھناؤنی تصاویر پیش کرتے ہیں۔ منصور بہ ندوی کمیشن کو صرف یہ طے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ انہیں فلاں فلاں منصوبے کی تکمیل کے لیے فلاں فلاں مقامات پر اتنے انسان درکار ہیں۔ پھر پولیس اور فوج ان بے بس اور مظلوم افراد کو خفیہ کارروائیوں کے ذریعہ اس بے دری کے ساتھ ان مقامات پر پہنچاتی ہے کہ ان بیچاروں کے بیوی بچوں تک کو ان کی خبر تک نہیں ہوتی اور وہ ان سے زیادہ سے زیادہ مشقت لینے کے لیے ان سے ایسا انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے کہ جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے مختصر طور پر مادی فلسفہ حیات کے مختلف پہلوؤں اور اجتماعی زندگی پر ان کے اثرات کا جو جائزہ لیا ہے اس پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت میں رُوح کے اعتبار سے قطعاً کوئی فرق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں نظاموں نے جو تہذیب پیدا کی ہے وہ بالکل ایک جیسی ہے۔ ہمارے اس ملک میں اشتراکیت کے علمبرداروں میں وہی لوگ شامل ہیں جو مغربی تہذیب کے پرستار ہیں اور اسلام کی اخلاقی قیود کو اپنے لیے بار سمجھتے ہیں۔ اسی لیے انہیں اپنی عافیت اس میں نظر آتی ہے کہ وہ اشتراکیت کو اپنالیں۔ اخلاقی احساسات ان کے اندر پہلے ہی مزچکے ہیں۔ رُوح ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہی کے اخلاقی ضابطوں سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ اس بنا پر اشتراکیت اختیار کرنے ہی میں انہیں راہ نجات دکھائی دیتی ہے۔

## نوٹ

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کا فون نمبر ۲۵۰۷  
 سے تبدیل ہو کر نمبر ۵۲۵۰۷ ہو گیا ہے۔